

اردو ڈرامے کا سفر

ڈاکٹر محمد طالب

شعبہ اردو، دیال سنگھ کالج، دہلی یونیورسٹی

تلخیص

اردو ڈرامہ برصغیر کی ادبی روایت کا ایک اہم اور زندہ فن ہے، جس نے وقت کے ساتھ مسلسل ارتقا کی منازل طے کی ہیں۔ اس کی ابتدا اگرچہ انیسویں صدی سے ہوئی، لیکن جلد ہی اس نے ادب اور فنِ اداکاری کو ایک خوبصورت امتزاج عطا کر دیا۔ ابتدائی دور میں اردو ڈرامہ محض تفریح کا وسیلہ نہیں تھا بلکہ سماجی اصلاح، اخلاقی تربیت اور انسانی اقدار کی ترویج کا مؤثر ذریعہ بھی تھا۔ آغا حشر کاشمیری نے اپنے فنی شعور، جاندار مکالموں اور ڈرامائی اسلوب سے اردو ڈرامے کو نئی زندگی بخشی اور اسے عوامی و ادبی سطح پر غیر معمولی مقبولیت عطا کی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ریڈیو اور پھر ٹیلی ویژن نے اردو ڈرامے کو اظہار کی نئی وسعتیں فراہم کیں۔ اس دور میں تخلیق کیے گئے ڈراموں نے معاشرتی مسائل، انسانی نفسیات، خاندانی رشتوں اور تہذیبی اقدار کو نہایت فنکارانہ انداز میں پیش کیا۔ اشفاق احمد، بانو قدسیہ، حسینہ معین اور امجد اسلام امجد جیسے ادیبوں نے اردو ڈرامے کو فکری گہرائی، ادبی وقار اور فنی پختگی سے آراستہ کیا۔ آج ڈیجیٹل میڈیا کے دور میں بھی اردو ڈرامہ اپنی اہمیت برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اگرچہ اس کے موضوعات اور پیشکش کے انداز میں تبدیلی آئی ہے، تاہم یہ صنف اب بھی انسانی جذبات، سماجی شعور اور تہذیبی شناخت کی مؤثر ترجمان ہے۔ یہی مسلسل ارتقا اردو ڈرامے کے تابندہ اور ہمہ گیر ادبی سفر کی روشن علامت ہے۔

کلیدی الفاظ: برصغیر روایت انیسویں صدی ٹیلی ویژن ریڈیو انسانی اقدار نفسیات معاشرتی مسائل سماجی اصلاح تہذیبی شعور

مشرق میں ہندوستان اور مغرب میں یونان کا نام ڈرامے کی مادرِ وطن کے طور پر لیا جاتا ہے۔ یونانیوں کے لیے ڈرامہ کر کے دکھائے جانے والی کہانی کا درجہ رکھتا تھا۔ ہندوستانی یعنی سنسکرت ڈرامے کی روایت زیادہ دلچسپ ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ دیوتا آنتاہٹ سے پریشان ہو کر راجہ اندر کے پاس گئے کہ ان کے لیے کوئی دلچسپ مشغلہ مہیا کریں۔ راجہ اندر ان کو برہما کے دربار میں لے گئے۔ برہما نے رگ وید سے رقص، سام وید سے سرور، یجر وید سے حرکات و سکنات اور اتھرو وید سے اظہار جذبات کا طریقہ اخذ کر کے پانچواں وید مرتب کیا اور 'نہیہ وید' اس کا نام پڑا۔ یہی نسخہ آگے چل کر 'شکنتلا' جیسے قدیم ناولوں کی ترتیب میں کام آیا۔ ان ناولوں میں رقص و سرور کے علاوہ اظہار جذبات اور حرکات و سکنات کو جو جگہ دی گئی وہی ہر ملک اور ہر زمانے میں ڈرامے کی امتیازی خصوصیت رہی۔ یونان سے ارسطو کی تین وحدتوں کے تصور کے ساتھ ڈرامہ انگلستان فرانس اور اسپین پہنچا لیکن یورپی

ڈرامے میں نئے نئے تجربات بھی کیے جاتے رہے۔ یہاں یہ دہرانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ناول اور افسانے کی طرح ڈرامہ بھی زندگی اور زندہ انسانوں کے مسائل پر مبنی ہوتا ہے۔

ہندوستان میں سنسکرت ڈرامے کی تاریخ تقریباً ڈھائی ہزار سال پرانی ہے اور اس میں حسن و عشق، ہجر وصال اور رقص و موسیقی کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ سنسکرت ڈرامے کے برعکس اردو ڈرامہ کی روایت نہایت مختصر یعنی لکھنؤ کے نواب واجد علی شاہ (۱۸۲۷-۸۷ء) کے ہاتھوں شروع ہوا۔ نوجوانی میں واجد علی شاہ نے رہس کے چھبیس جلسے ترتیب دیئے تھے جو رادھا و کنھیا جی کی داستانِ عشق پر مبنی تھے اور یہ اصلاً ناچ گانے کے ڈرامے ہو کر تھے۔ رادھا کنھیا کا پہلا قصہ واجد علی شاہ نے ۱۸۴۴ء میں لکھا تھا۔ انہوں نے اس کہانی کے کرداروں کے زیورات اور پوشاکوں کی جو تفصیلات فراہم کی ہیں، ان میں کئی لاکھ روپے خرچ ہوئے تھے۔ بارہ قسم کے کرداروں میں سے صرف دو کے لباس کی تفصیل یہ تھی:

۱۔ کنھیا جی: کارچولی مکٹ، کارچولی گلونیہ، جانگھیا، گھاگھرا، چاندی کی بانسری،

۲۔ رادھا: لہنگا، پھریا، بٹوز، نتھے، پینا اور تمام ہندوانہ زیورات

اس ابتدائی ڈرامے جن پریمیاں، جوگن، سکھیاں، مکھن والیاں، پنہانیں اور مسافر وغیرہ کردار ہوتے تھے۔ واجد علی شاہ خود کنھیا بنے تھے اور یہ ڈرامے قیصر باغ لکھنؤ میں کھیلے جاتے تھے۔ رادھا اور کنھیا کے علاوہ واجد علی شاہ نے اپنی تین مثنویوں کو بھی نائک کی شکل دی جو ۱۸۵۱ء میں کھیلے گئے ان کو صرف نواب اور ان کے درباری دیکھتے تھے۔

لیکن اردو کا پہلا عوامی ڈرامہ امانت کا اندر سبھا ہے جو ۱۸۵۴ء کے بعد سے سیکڑوں مرتبہ شائع ہوا اور گاؤں و قصبوں میں پچاسوں سال تک دکھایا جاتا رہا۔ یہاں تک کہ N.S.D نے بھی اس کو کئی بار کھیلا۔ انڈیا آفس لائبریری میں 'اندر سبھا' کے ۴۸ ایڈیشن موجود ہیں جن سے اکتیس فارسی رسم الخط میں گیارہ دیوناگری میں پانچ گجراتی میں اور ایک گورکھی خط میں ہے۔ پھر اندر سبھا کے طرز پر مداری لال، فرخ، راحت اور ہندو سبھا و کرزن سبھا وغیرہ کے عنوانات سے تقریباً ایک درجن ڈرامے لکھے گئے۔ اصل اندر سبھا تمام تر نظم میں ہے اور راجہ اندر کے دربار کی ایک پری ایک آدم زاد یعنی شہزادہ گلغام سے عشق کرنے لگتی ہے تو راجہ اندر اس کے پرکٹو اس کو دربار سے نکلوا دیتے ہیں۔ سبز پری شہزادے کے عشق میں جوگن بن جاتی ہے اور ایک دن کامیاب ہوتی ہے۔ امانت کی اندر سبھا میں تمام غزلیں خود امانت کی طبع زاد ہیں اور درمیان میں چھیند ٹھمیریاں اور ہرہ گیت بھی شامل ہیں۔ کچھ نمونے

راجا ہوں میں قوم کا اندر میرا نام
جن پر یوں کی دید کے مجھے نہیں آرام
مفضلِ راجہ میں پکھراج پری آتی ہے
سارے معشوقوں کی سرتاج پری آتی ہے

معمور ہوں شوخی سے شرارت سے بھری ہوں
 دھانی مری پوشاک ہے میں سبزپری ہوں
 یہی ہے شہزادہ مرا یہی ہے میری جان
 یہی مرا دلدار ہے میں اس پر قربان
 سنورے مری دیوار سے دل کو نہیں قرار
 جلدی میرے واسطے سبھا کرو تیار
 تخت بچھاؤ جگمگا جلدی سے اس آن
 مجھ کو شب پھر بیٹھا محفل کے درمیان
 آنکھوں میں محبت کا کنول جب سے کھلا ہے
 آتے ہیں نظر کوچہ و بازار بستی

اندر سبھا میں بنیادی Tension سبزپری اور زمین کی مخلوق گلغام کے درمیان عشق سے شروع ہوتا ہے اور وہ جنگلوں کی خاک چھان کر اپنے محبوب کو حاصل کر کے کامیاب ہوتی ہے۔ دراصل 'اندر سبھا' اودھ کے علاقے کی اس ڈرامائی فضائی پیداوار ہے جس میں رام لیلا ہنس اور نوٹکی کی ڈرامائی شکلیں زمانہ قدیم سے موجود تھیں۔ 'اندر سبھا' کی شہرت کے زیر اثر بنگال کے تاریخی شہر ڈھاکہ میں شیخ پیر بخش کانپوری نے 'اندر سبھا' کی طرز پر ایک ڈرامہ 'ناگر سبھا' لکھا جس کو شہر کے متعدد نائک سبھاؤں میں سب سے زیادہ معروف، فرحت افزا تھیٹر ریکل کمپنی نے کھیلا۔ اس کے بعد ڈھاکہ کی مختلف کمپنیوں نے 'گلشن جانفزا'، 'بلبل بیمار وغیرہ شعری ڈرامے اسٹیج کیے گئے۔ اودھ میں کمسن لڑکے، لڑکیوں کے کردار کرتے تھے جبکہ بنگال میں طوائفیں عورتوں کے کردار کرتے تھے، یہ ڈرامے زیادہ تر یوپی کے مصنفین اردو میں لکھتے تھے۔ بنگال نوابین و زمینداران کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور ان کی حویلیوں میں 'جلسہ گھر' یعنی اسٹیج بنے ہوتے تھے۔ اردو کے یہ ابتدائی ڈرامے اکثر معمولی قسم کی شاعری سے آراستہ اور عامیانہ و Melodramatic ہوا کرتے تھے۔

اُدھر بمبئی کے پارسی سینٹھوں نے بھی ۱۸۵۷ء کے بعد عامیانہ اور سوقیانہ قسم کے ڈرامے اسٹیج کرنا شروع کر دیے تھے۔ ان پارسی ڈراموں میں اکثر اردو داں ہوتے تھے۔ گوا اور بمبئی کے پر تگالی پادری بھی اس دور میں کچی پکی فارسی اور اردو میں عیسائی مسیح کی زندگی سے متعلق ڈرامے اسٹیج کرتے تھے۔ بمبئی گزٹ کے مطابق ۱۷۷۰ء میں عوام سے چندہ کر کے بمبئی تھیٹر قائم کیا گیا جو زیادہ نہ چل سکا۔ بمبئی تھیٹر میں انگریزی ڈرامے دکھائے جاتے تھے اور یہاں ہندوستانیوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ ۱۸۲۶ء میں سرفرام جی کاؤس جی اور سیٹھ جگن ناتھ کی کوششوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی اجازت سے یہ تھیٹر تیسری دفعہ شروع ہوا۔ اس دفعہ اس میں انگریزی اور ہندوستانی

دونوں زبانوں میں ڈرامے دکھائے جاتے تھے۔ ۱۸۵۴-۱۱-۲۶ کو یہاں پہلا اردو ڈرامہ 'گوپی چند جلدھر' دکھایا گیا اسی طرز پر کچھ پارسی نوجوانوں نے گجراتی میں ڈرامے دکھانے شروع کر دیئے۔ بقول عبدالعلیم نامی ۱۸۵۴ کے دورانہ میں بہمنی میں درجنوں تھیٹر لکل کمپنیاں قائم ہو چکی تھیں جو زیادہ تر پیسہ کمانے کے لیے اردو ڈرامے اسٹیج کرتی تھیں۔ ان ڈراموں میں نثری مکالمے اور درمیان میں غزلیں اور گیت بھرے ہوتے تھے۔

پارسی تھیٹر کمپنیوں میں نوشتروں جی مہروان جی آرام، کنور جی ناظم آئیڈیل جی گھوری، دادا بھائی ٹھوٹھی، دادی ٹیل، پیسٹن جی فرام جی اور کاوس جی میر فری گاندھی بطور مالکان مشہور ہوئے ان پارسی کمپنیوں کے نام تھے:

- الرٹ نائک منڈلی
- الفشن ڈرامہ کلب
- پارسی اوپرا ٹروپس
- پرشتین نائک منڈلی
- پرشتین زور اسٹریٹ نائک
- وکٹوریہ نائک منڈلی
- ہندی نائک منڈلی

ان کمپنیوں کے ڈراموں کا نقشہ کھینچتے ہوئے اور اردو ڈرامہ داد بھائی ٹھوٹھی نے لکھا تھا تختوں اور بیچوں کا اسٹیج بنایا جاتا۔ اسٹیج کے دائیں بائیں ایکٹروں کے بیٹھنے کے لیے کرسیاں رکھی جائیں جن پر بیٹھ کر وہ میک اپ کرتے اور کپڑے بدلتے تھے۔ اسٹیج کے سامنے کرسیاں صوفے مونڈھے، اسٹول اور بچیں رکھ دی جاتیں۔ تماشا کی بھی اپنے اپنے گھروں سے کرسیاں اور دستی پنکھے لے آتے۔ اسٹیج کی پشت پر ایک سفید پردہ ڈال دیا جاتا۔ ایکٹرا اپنے پرائیویٹ کپڑوں میں جن کو وہ بیکار سمجھتا ملبوس ہو کر اسٹیج پر آتا۔ وہ حسب ضرورت اپنے کپڑوں پر رنگ برنگ کی اتزق اور پٹیاں چپکالیتا۔ سیدھی سادی زبان میں اپنا مطلب بیان کرتا۔ ڈراما عموماً پانچ اور چھ بجے کے درمیان میں شروع ہوتا اور ایک گھنٹے میں ختم ہو جاتا۔ ایکٹروں کو آلات موسیقی سے کوئی واسطہ نہ رہتا۔ یہاں تک کہ روشنی بھی غیر ضروری سمجھی جاتی۔ اگر کوئی شخص کسی ایکٹر کو کچھ انعام دینا چاہتا تو وہ اس کو اشارے سے بلاتا وہ اس کے پاس آتا۔ انعام لیتا، سلام کرتا اور پھر اپنے رول میں مصروف ہو جاتا۔ اندازہ ہوتا ہے کہ پارسی ڈرامے نے اندر سبھا، رام لیلا اور رہس سے گہرے اثرات قبول کیے ہوں گے۔ بعد میں روشنی موسیقی اور مشینوں اور تصویروں کا استعمال شروع ہوا اور Green Room بنے۔ جمشید جی، بسنیں جی کھمہاٹا نے اپنی سوانح میں لکھا ہے کہ کھیت باڑی (بہمنی) کے ایک بنگلے کے ہال میں جب ناریل کے تیل کے پچاس چراغ جلا کر روشنی کی جانے لگی تو ڈرامہ سورج ڈھلنے کے بعد ہونے لگا۔

لیکن ان پارسی اکابرین کے لیے بڑا مسئلہ ان کے دستوروں نے پیدا کیا، کیونکہ وہ ابھی مسلمان مولویوں کی طرح ڈرامہ اور ناچ گانے کا مخرب اخلاق سمجھتے تھے لیکن پارسی اخبارات نے فن کاروں کا ساتھ دیا اور پارسی تھیٹر ترقی کرتا رہا۔ یہی نہیں کچھ پارسی رہنماؤں نے 'انجمن ترقی فن موسیقی' قائم جس کا مقصد بھی پارسیوں کو اداکاری اور موسیقی کی تعلیم مفت فراہم کرتا تھا۔ پارسی فنکاروں نے ایرانی ڈرامے جیسے 'رستم و سہراب' اور شہزادہ سیاوش وغیرہ بھی دکھائے اور ہندو مذہب کے واقعات کو بھی اسٹیج کیا۔ پارسیوں نے اردو ڈرامے نور جہاں، قصہ بدر منیر، الہ دین کا چراغ، اندر سبھا، سلیمانی شمشیر پاک دامن گنانا وغیرہ دکھائے گئے۔ ایک بار ڈرامہ الہ دین کا چراغ جن میں جادوگر، الہ دین کا محل، مشینوں کی مدد سے اٹھا کر افریقہ لے جاتا تھا کہ زنجیر ٹوٹ گئی اور سات اداکار آسمان سے گرنے کی بنا پر شدید زخمی ہو گئے تھے۔ ان ڈراموں نے ہلکے پھلکے کاروباری تماشے کیے بہر حال تھیٹر کی روایت کو مضبوط کیا۔ ابتدا میں پارسی ڈراموں کے مصنف یا منشی پارسی میں ہوتے تھے لیکن جیسے جیسے اردو تھیٹر کی مقبولیت بڑھی۔ یوپی، اودھ اور پنجاب وغیرہ کے اردو ڈرامہ نگار منشی کے فرائض انجام دینے لگے۔ ان اردو داں مصنفین میں رونق بنارسی، حسینی میاں ظریف، جناب رام پوری، طالب بنارسی، جوہر بنارسی، بزرگ لاہوری، امر اعلیٰ، مراد بیلوی، حافظ عبداللہ اور احسن لکھنوی وغیرہ مشہور ہیں۔ ان بزرگوں کے ڈرامے اکثر گوند اور قنچی سے بنائے جاتے تھے اور شاید اسی لیے ان ڈراموں کو کمپنیوں نے رجسٹر کرنا شروع کر دیا تھا۔ مثال کے طور پر ظریف کے ڈرامے عشق، کے سرورق پر یہ وارنگ درج تھی۔

”یہ قصہ ۲۵ ویں قاعدے کے مطابق داخل رجسٹر ہوا ہے اور اس کے تمام حقوق سے بھگوان داس کی کمپنی نے اپنے قبضے میں رکھے ہیں۔ اس لیے کوئی صاحب چھاپنے کا قصد نہ کرے اور عوض فائدے کے نقصان نہ اٹھاوے۔“

لیکن ظریف کی اصلیت سے آگاہ کرتے ہوئے دادا بھائی رتن جی ٹھوٹھنی نے لکھ دیا تھا، ظریف، بھگوان داس کے یہاں ملازم تھا۔ تین روپے ماہوار تنخواہ پاتا تھا ہماری کمپنی کے ڈرامے چراچرا کر لکھتا اور بیچتا تھا۔“

پارسی تھیٹر کی دنیا میں سب سے بڑا نام آغا حشر کاشمیری کا ہے جو ۱۸۶۸ء میں بنارس میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۸۹۷ء میں پارسی الفریڈ تھیٹر کمپنی بنارس آئی تو حشر کو بھی ڈرامے دیکھنے اور لکھنے کا چسکہ لگ گیا۔ اگلے سال وہ بمبئی میں الفریڈ ٹائیک کمپنی کے مالکان سے ملے اور انہیں اپنے کچھ اشعار سنائے۔ سیٹھ کاؤسن جی نے ان کو پندرہ روپے ماہانہ پر ملازم رکھ لیا۔ یہاں ان کا پہلا ڈرامہ 'مرید شک' ۱۸۹۹ء میں اسٹیج ہوا اور اس قدر کامیاب ہوا کہ اگلے نو ماہ میں ساٹھ مرتبہ اسٹیج کیا گیا۔ یہ ڈرامہ طبع زاد نہیں تھا اور خود آغا حشر نے آگاہ کیا تھا کہ یہ شیکسپیر کے ڈرامے wmters tale کا آزاد ترجمہ تھا۔ 'مرید شک' کے بعد آغا حشر پارسی تھیٹر کے بے تاج بادشاہ بنتے چلے گئے اور نا سبھ لوگ ان کو ہندوستانی ڈرامے کا شیکسپیر تک کہنے لگے۔ ان کی دن دوئی رات چوگنی ترقی کی عکاسی کرتے ہوئے دادا بھائی ٹھوٹھنی نے لکھا تھا:

حشر، کھٹا کی کمپنی میں پندرہ روپے ماہوار پر ملازم ہوا تھا۔ مرید شک کے بعد اس کی تنخواہ چالیس روپے ماہوار ہو گئی۔ 'اسیر حرص' کے بعد اسی روپے اس کے بعد بمبئی تھیٹر کے مالک نوروز جی پری نے سوا سو روپے ماہوار پر ملازم رکھ کر اس سے ڈرامہ دام

حسن، لکھوایا۔ اس زمانے میں یہ رقم گراں قدر سمجھی جاتی تھی۔ آغا حشر نے زیادہ تر شیکسپیر کے ڈراموں کو ہندوستانی رنگ میں ڈھالا۔ ان کے

ڈراموں کی فہرست یہ ہے:

- ۱۔ مرید شک
- ۲۔ اسیر حرص
- ۳۔ شہناز
- ۴۔ صید ہوس
- ۵۔ سفید خون
- ۶۔ سلور کنگ
- ۷۔ خواب ہستی
- ۸۔ یہودی کی لڑکی
- ۹۔ ستیا بن باس
- ۱۰۔ بھیشم پرگتیا
- ۱۱۔ رستم و سہراب
- ۱۲۔ آفتاب محبت
- ۱۳۔ خوبصورت بلا
- ۱۴۔ ترکی کی حور
- ۱۵۔ ملیا مستنکل (سوردا س)
- ۱۶۔ ہندوستان
- ۱۷۔ آنکھ کا نشا
- ۱۸۔ بھارت وحشی

آغا حشر فارسی اور اردو کے علاوہ ہندی اور سنسکرت بھی خوب جانتے تھے کیونکہ وہ آریہ سماجی مہاشوں سے مذہبی مناظرے کیا کرتے تھے۔ ان کے ڈرامے جذباتی شاعری سے آراستہ اور مکالمے چست اور زبان عالمانہ ہوئی تھی۔ مثلاً ان کے ڈرامے خوب صورت بلا سے ایک اقتباس:

”طغرل: کیا تو مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے؟

شہریار: اس کا جواب آئینہ دے گا۔

طغرل: کیا تو مجھ سے مقابلہ کر کے جیت جائے گا؟

شہریار: اس کا جواب قسمت دے گی۔

طغرل: دیکھ میں تجھ سے زیادہ تسنیم کا حقدار ہوں۔

شہریار: کس طرح؟

طغرل: اس طرح کہ تو ایک معمولی افسر ہے اور میں سپہ سالار ہوں

شہریار: تو کیا عشق و محبت پر سپہ سالاروں کی مہر لگی ہوئی ہے؟

طغرل: چپ بے لگام

شہریار: کیوں؟

طغرل: کیونکہ تو میرا ماتحت ہے۔

شہریار: اگر افسری اور ماتحتی پر دار و مدار ہے تو بندے ایسی نوکری سے بیزار ہے۔

طغرل: شہریار! ہوش سنبھال

شہریار: اپنی نوکری بھاڑ میں ڈال۔

طغرل: یہ ہے پکڑ لو۔ پکڑ لو

تسنیم: دھوکا، دھوکا یا پروردگار۔

طغرل: خبردار!

اور شعری مکالمے اس قسم کے ہوتے تھے:

جس کی چپک ہو چند گھڑی وہ شرر ہوں میں

یا مال سا نشانِ سرِ رگزر ہوں میں

دھوکا ہے میرے زیت فریب نظر ہوں می

کیا غم جو بچھ گیا کہ چراغِ سحر ہوں میں

آغا حشر کے انداز کے ڈرامے آرزو لکھنوی، رادھے شیام، کتھا واپک، کرشن چندر زیبا اور حکیم احمد شجاع نے لکھے جو آغا حشر

کے شاگرد تھے وہ کلکتے میں ہندی میں ڈرامے لکھتے رہے۔ پھر ۱۹۲۴ء جب انہوں نے اپنی ڈرامہ کمپنی بنائی اور شہر شہر گھومنے لگے۔ چر

کھاری (اعظم گڑھ) کے نواب نے ان کی کمپنی پچاس ہزار میں خرید لی اور آغا حشر کے شاگرد بن گئے۔ یہ کمپنی بانس بریلی جا کر بند ہوئی۔

اب تک فلموں کا دور شروع ہو گیا تھا اور انہوں نے پارسی تھیٹر کو پوری طرح اپنا لیا تھا۔ آغا صاحب نے دو فلموں شیریں فرہاد، اور عورت کا پیار کی کہانی لکھی اور ہیروئن مختار سے عشق بھی لڑایا لاہور میں فلم بھیشم پر تھکیا، کے فلمانے کی تیاری کر رہے تھے کہ ۱۲۸ اپریل ۱۹۵۴ کو انتقال ہو گیا، جہاں دس سال بعد منٹو کو دفن ہونا تھا۔

آغا حشر کے بعد پارسی تھیٹر کا خاتمہ مکمل ہو گیا اور ناچ گانوں و اچھل کود سے بھرپور فارمولوں نے ان کی جگہ لے لی۔ حشر کے شاگرد حکیم احمد شجاع اور امتیاز علی تاج سنجیدہ ڈرامے کی طرف مائل ہوئے۔ تاج کے والد شمس العلماء مولوی ممتاز علی دارالاشاعت پنجاب جیسا موقر اشاعت خانہ چلاتے تھے اور عورتوں کے لیے تہذیب نسواں، اور بچوں کے لیے پھول، دور سائل بھی شائع کرتے تھے۔ تاج کے سنجیدہ اردو ڈرامے لکھنے شروع کیے اور ۱۹۳۲ میں اپنا شاہکار انارکلی لکھا جس پر فلمیں بھی بنیں اور انارکلی کے کردار کو مرکز میں دے کر گیت بھی لکھے گئے۔ انارکلی کا مزار آج کل مال روڈ، لاہور کے سرکاری دفاتر کے درمیان گمنام حالت میں ہے کہا جاتا ہے کہ وہ نادرہ بیگم یا شرف النساء نام اکبر کی کنیز تھی جس کو ایک دن اکبر نے شہزادہ جہانگیر کو اشارے کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور سزا کے طور پر زندہ دیوار میں چنوا دیا تھا۔ انارکلی کے تماشے کے لیے اس قدر اسباب لازم تھا کہ کوئی کمپنی اس کو اسٹیج کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئی لیکن اس پر دو فلمیں: انارکلی اور مغل اعظم بنی۔ ڈرامے کے مرکزی کردار سلیم انارکلی اکبر اور دلارام ہیں۔ ثریا مہارانی، بختاور داروغہ زندان اور انارکلی کی بوڑھی ماں اس طویل ڈرامے کے ضمنی کردار ہیں۔ اس کی زبان فارسی زدہ اور مکالموں کا آہنگ نہایت بلند ہے۔ یہاں مغل درباروں کے پس پردہ جوڑ توڑ اور باہمی سازشوں کو بڑے حقیقی انداز سے اُجاگر کیا گیا ہے۔ تاج کے ہم عصروں شوق قدوائی، مولانا ظفر علی خاں اور منشی پریم چند نے اکاڈا ڈرامے تحریر کیے۔ لیکن یہ ڈرامے کتابوں تک محدود رہ گئے ۱۹۳۵ء میں جب آل انڈیا ریڈیو شروع ہوا تو ڈرامے کو ایک نیا سسٹم مل گیا۔ اردو، ہندی کے بہت سے سرکردہ ادیبوں نے ریڈیو ڈرامے لکھے۔ سعادت حسن منٹو اور اوپندر ناتھ اشک دلی ریڈیو اسٹیشن پر ملازم تھے۔ منٹو کی خاصیت یہ تھی کہ ٹائپ رائٹر پر ایک ہی بار میں ڈرامے کا فائنل ڈرافٹ تیار کر دیا کرتے تھے اور کوئی پروڈیو سر ڈائریکٹران کے لکھے ہوئے پر قلم نہیں گاتا تھا۔ منٹو نے اپنی ۴۳ سالہ زندگی میں ڈیڑھ سو کے قریب ڈرامے لکھے جن میں سے بہت سے ریڈیو کی فائلوں میں گم ہو چکے ہیں۔ ان کے مشہور ڈراموں میں جرنلسٹ ہتک، پتی رگیں، اس منجدھار میں کمیشن اور کٹاری وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں کہیں مردانہ سماج میں عورت کے استحصال، کہیں نوجوان نسل کی بے روزگاری کے مسائل اور کہیں عورت اور مرد کے ازلی رشتوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ڈرامہ، جرنلسٹ، میں اخبار کے مالکان کی ہوس پرستی کو موضوع بنایا گیا تھا اور یہ اس قدر مشہور ہوا کہ اخبارات کے مالکان نے اس کا نشریہ بند کر دیا تھا۔ منٹو-۴۲ ۱۹۴۰ میں ڈھائی برس ریڈیو پر رہے اور ان کے ریڈیو کے ساتھیوں میں کرشن حیدر، اوپندر ناتھ اشک، ان م راشد بہزاد لکھنوی، لالہ حفیظ جاوید اور رفیع پیر کے علاوہ اختر بی بی فیض آبادی، انوری بائی آگرے والی، استاد عبدالکریم خان اور استاد عبدالعزیز خاں بین کار وغیرہ شامل تھے۔

۱۹۴۷ء کے بعد کرشن چندر، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، اصغر بٹ اور حبیب تنویر وغیرہ ڈرامے لکھتے رہے جو کچھ تو کتابوں تک محدود رہے کچھ ریڈیو تک۔ ڈرامے کو اسٹیج تک پہنچانے کا سب سے اہم کردار ترقی پسند ادیب حبیب تنویر نے کیا۔ انہوں نے اپنا پہلا ڈرامہ آگرہ بازار جو اردو کے مشہور عوامی شاعر نظیر اکبر آبادی کی زندگی پر لیس تھا، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اپریل ۱۹۵۴ء میں یوم نظیر کے موقع پر اسٹیج کیا۔ اس ڈرامے میں نزدیکی گارڈوں اور نشستوں سے اداکار چنے گئے تھے اور اس عہد کے سماجی وادبی حالات کی عکاسی کی گئی تھی جو میر تقی میر اور مرزا غالب کے درمیان تھا۔ اس کے بعد حبیب تنویر نے چھتیس گڑھ کے لوگ کلا کاروں کو لے کر ہندوستانی تھیٹر بنایا اور چرن داس چور، جیسے عوامی ڈرامے دکھائے۔ کرشن چندر نے اپنے ڈرامے 'سوائے' کے باہر 'گوریڈیو پر بھی پیش کیا اور اس پر فلم بھی بنائی۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں ڈاکٹر محمد حسن نے طلباء کے ساتھ مل کر ایک ڈرامہ کلب بنایا لیکن یہاں کے مذہبی ماحول میں لڑکیوں کو اسٹیج پر کام کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ محمد حسن نے درجنوں کتابی ڈرامے لکھے، جن میں سے ضحاک ایمر جنسی ۱۹۷۵ء کے خلاف لکھا گیا علامتی افسانہ تھا جس کی جوہر لعل نہرو یونیورسٹی میں ریڈنگ کی گئی۔ یہ ڈرامہ ایران کے ایک ظالم بادشاہ کے مظالم کے خلاف تھا جس کے خلاف کاوانام کے ایک لوہار نے علم بغاوت بلند کیا تھا۔ ضحاک کے کندھوں پر دو سانپ نکلتے تھے جو روزانہ دو انسانوں کا مغز کھاتے تھے

۱۹۶۹ء میں جب ملک بھر میں غالب صدی منائی گئی اور ایوان غالب قائم ہوا تو سید مہدی نے غالب کی شخصیت اور شاعری پر ڈرامہ غالب کون ہے لکھا جو بیسوں دفعہ شیلہ بھائیہ اور عزیز قریشی کی ہدایت میں اسٹیج کیا گیا۔ غالب ہی کو بنیاد بنا کر اسی سال ڈاکٹر محمد حسن نے کھرے کا چاند لکھا اور مشہور ناول 'مجھے چاند چاہئے' کے مصنف سریندر ورمانے پچھلے سالوں میں قید حیات لکھا۔ ابراہیم یوسف اور اقبال مجید نے بھی کافی ڈرامے لکھے جن میں سے چند اسٹیج بھی کیے گئے۔ پاکستان میں ڈرامے کو ٹیلی ویژن کا سہارا ملتا تو اشفاق احمد، بانو قدسیہ، شوکت صدیقی، اصغر ندیم سید اور منتشا یادو وغیرہ نے ڈراموں کو سریلوں کی شکل دے دی۔ جواب ہندوستان میں بھی دکھائے جا رہے ہیں کرتار سنگھ ڈگل اور بلونت گارگی اردو ڈرامے کو چھوڑ کر پنجابی کی طرف چلے گئے۔ دہلی میں سراج انور نے چچا چھکن سر تیر کے ڈرامے ریڈیو کے لیے لکھے تو قدسیہ زیدی نے کئی غیر ملکی ڈراموں کے ترجمے پیش کیے۔ دہلی اردو اکادمی اور نیشنل اسکول آف ڈرامہ بھی ہر سال اردو کے کچھ ڈرامے پیش کرتے ہیں۔ اصغر وجاہت کا ہندوستانی زبان کا ڈرامہ، جس لاہور میں دیکھا وہ جماعتیں بار بار اسٹیج کیا گیا جس طرح گریٹ کر تار کا ڈرامہ تعلق بار بار دکھایا جاتا ہے۔ عبدالغفار سرہولی اور ڈاکٹر عابد حسین نے بچوں کے لیے ڈرامے لکھے جو اسٹیج نہ ہو سکے۔ مریم گوہر نے پاکستان میں اپنے گروپ جو کا کے ذریعے مقصدی تھیٹر کو فروغ دیا۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نامی نور الہی محمد عمر عشرت رحمانی اور ڈاکٹر شاہد حسین نے اردو ڈرامے کی تاریخ پر بڑا تحقیقی کام کیا اور آج کل سعید عالم اردو ڈرامے کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔
